ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.8. No.2.2025

اردو شاعری کے اصلاحی دور کی زبان: ایک مختصر مطالعہ

ڈاکٹر غلام یٰسین

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر عثمانیہ سلطانہ

عسکری X، لاہور

ڈاکٹر سیدہ شاہین زیدی

C-82، ویلنشیا ٹاؤن، لاہور

Abstract:

*The **"Islah-e-Zaban" (Reform of Language)** movement marks a significant milestone in the history of the Urdu language, particularly gaining momentum in the 18th and 19th centuries within prominent literary centers like the **Delhi School (Dabistan-e-Delhi)** and the **Lucknow School (Dabistan-e-Lucknow)**. The primary objective of this movement was to refine, embellish, and standardize Urdu, transforming it into a sophisticated, eloquent, and articulate language. It aimed to elevate Urdu from colloquial and vernacular usage to a high literary pedestal. This involved purifying its vocabulary, streamlining its grammar, and establishing norms for poetic and prose expression, thereby enhancing its prestige and aesthetic appeal. The movement played a crucial role in shaping modern Urdu, making it a powerful vehicle for literary, intellectual, and cultural expression.*

مقالہ:

اردو زبان کی تاریخ میں "اصلاحِ زبان" کی تحریک ایک سنگ میل ثابت ہوئی، بالخصوص اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں "دبستانِ دہلی" اور "دبستانِ لکھنؤ" جیسے ادبی مراکز میں یہ زوروں پر دکھائی دی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد اردو زبان کو نکھارنا، سنوارنا اور اسے ایک معیاری، فصیح و بلیغ صورت دینا تھا۔ یہ تحریک اردو کو روزمرہ اور عامیانہ پن سے نکال کر ایک بلند ادبی مقام پر فائز کرنے کے لیے وجود میں آئی۔

اصلاحِ زبان کی تحریک کے لیے کئی عوامل اور محرکات کارفرما دکھائی دیتے ہیں:

- فارسی اور ہندی کا امتزاج: ابتدا میں اردو زبان فارسی، ہندی، عربی اور مقامی بولیوں کے الفاظ کا ایک حسین امتزاج کی حامل تو تھی، لیکن ایک باقاعدہ لسانی ڈھانچے اور قواعد سے محروم تھی۔
- "دبستانِ دہلی" میں میر جیسے شعرا کی عوامی اور سادہ زبان کے بعد شکوہِ الفاظ اور ادبی وقار پیدا کرنے کو ترجیح دی گئی۔ "دبستانِ لکھنؤ" نے تو اس رجحان کو بامِ عروج تک پہنچادیا۔
- الفاظ کے بے ترتیب استعمال یا مختلف علاقوں کے لہجوں کے امتزاج نے اردو زبان میں ابہام کی کیفیت پیدا کر دی تھی جس سے لسانی الجھنیں بڑھتی جارہی تھیں، جنھیں دور کرنا ضروری ہو گیا تھا۔
- زبان کو معیاری شکل دینا: ادبی سرپرستی میں اردو کو ایک ایسی معیاری شکل دینے کی کوشش کی گئی جو ہر طبقے اور علاقے کے لوگوں کے لیے عام فہم ہو۔

اصلاحِ زبان کی تحریک نے درج ذیل اہم پہلوؤں پر کام کیا جو اس تحریک کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں:

- مقامی بولیوں سے آئے ہوئے بہت سے غیر معیاری اور غیر فصیح الفاظ کو زبان سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی۔
- فارسی اور عربی کے الفاظ کو اردو زبان کے مزاج کا حصہ بنانے کے لیے شامل کیا گیا۔ اس ضمن میں ناسخ جیسے شعرا کی مشکل اور کم مستعمل عربی و فارسی الفاظ کو رواج دینے کی کوشش قابلِ تعریف ہے۔

- عام بول چال کے روزمرہ اور محاورات کو ادبی نزاکتوں اور قواعد کے مطابق ڈھال کر ان میں شگفتگی اور فصاحت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔
- شاعری میں صنائع و بدائع (جیسے ایہام، رعایتِ لفظی، تضاد، حسنِ تعلیل وغیرہ) کا کثرت سے استعمال کیا گیا تاکہ کلام میں خوبصورتی اور معنوی گہرائی پیدا ہو، اگرچہ بعض اوقات یہ محض لفظی بازی گری بن کر رہ جاتی تھی۔
- قواعد اور صرف و نحو کی درستی: زبان کے قواعد کو منظم کیا گیا تاکہ جملوں کی ساخت میں یکسانیت اور درستی آئے۔

اس تحریک کے اہم شعرا اور مراکز حسبِ ذیل ہیں:

- "دبستانِ دلی" کے زیرِ اثر ابتدائی طور پر سادگی پر زور دیا گیا، مگر بعد کے شعرا نے زبان کو سنوارنے کا رجحان کو پروان چڑھایا۔
- اصلاحِ زبان کی تحریک کا سب سے گہرا اثر "دبستانِ لکھنؤ" پر ہوا جس نے زبان کی اصلاح کے حوالے سے مرکزی کردار ادا بھی کیا۔ اس تحریک کے دو سب سے بڑے نام ہیں:
  - شیخ امام بخش ناسخ (جنھیں "معمارِ زبان" کے مرتبہ پر فائز کیا گیا ہے) نے زبان کی صفائی، بے کار الفاظ کے اخراج اور فارسی و عربی کے ثقیل مگر فصیح الفاظ کے استعمال پر زور دیا۔ ان کے ہاں رعایتِ لفظی اپنے عروج پر تھی۔
  - خواجہ حیدر علی آتش بھی لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کی اصلاحِ زبان کا انداز ناسخ سے مختلف تھا۔ انھوں نے محاورہ، روزمرہ اور ٹھیٹھ اردو الفاظ کو خوب صورتی سے استعمال کیا اور فضول رعایتِ لفظی سے گریز کیا۔ ان کی زبان فطری اور رواں تھی۔

"اصلاحِ زبان" کی تحریک نے اردو زبان و ادب پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے:

- "اصلاحِ زبان" کی تحریک نے اردو کو ایک معیاری اور شستہ زبان بنا دیا جو آج بھی ادبی حلقوں میں رائج ہے۔
- اس تحریک نے زبان کے استعمال میں نزاکت، نفاست اور فنی مہارت کو فروغ دے کر نئی ادبی اقدار کی راہیں ہموار کیں۔
- غیر ضروری الفاظ کے اخراج اور نئے الفاظ کے صحیح استعمال سے زبان کا ذخیرہ الفاظ مزید ثروت مند ہوا۔
- اس تحریک کے زیرِ اثر اردو ادب میں زبان، اسلوب اور شاعری کے فنی پہلوؤں پر نئی بحثوں اور تنقید کا آغاز ہوا۔

بلاشبہ "اصلاحِ زبان" کی تحریک نے اردو زبان کو وہ شکل دی جو آج اس کی پہچان ہے۔

> "ارباب علم و فضل کی اس قسم کی خدمات سے خود ہماری زبان محروم نہیں ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ہماری شاعری میں صنعت ایہام کا بہت زیادہ استعمال کیا جاتا تھا اور بھاشا الفاظ کی کثرت تھی۔ چنانچہ عہد محمد شاہ کے تمام شاعروں کا کلام اسی رنگ میں ہے۔ مگر اُسی دور میں مرزا مظہر پیدا ہوتے ہیں اور اس کے خلاف خیالات کی اشاعت کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض بڑے ہمعصروں کی مخالفت کے باوجود قدیم رنگ پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ عوام کا مذاق بدل جاتا ہے اور نئی پود بالکل نئے لفظی خزانوں کے ساتھ محفلوں میں داخل ہوتی ہے۔ اُس کی زبان میں کدہیں کی جگہ کبھی، کسو کی جگہ کسی، ٹک کی جگہ ذرا اور اس طرح کے سینکڑوں تبدیل شدہ الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ یہ تبدیلی نہایت قلیل عرصہ میں اس قدر اہم بن گئی تھی کہ سن رسیدہ شاعروں کو پنے قدیم کلام کی زبان پر نظر ثانی کرنی پڑی اور اپنی شاعری کا نیا انتخاب مرتب کرنا پڑا۔"[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

> "ردِ عمل کی تحریک نے اس دور کی اردو شاعری کو ایہام کی قید بے جا سے آزاد کر کے نئے امکانات سے روشناس کیا اور اس کے سامنے وسیع راستے کھول دیئے۔ فارسی شاعری کا وہ حصہ، جو ایہام کے رواج کے باعث عدم توجہی کا باعث تھا، اردو شاعری کی دسترس میں آگیا، اسی کے ساتھ فارسی شاعری کے سارے اسالیب، اصناف اور ہیئت اردو شاعری کے

لیے قابلِ قبول ہوگئے اورایک پختہ کارزبان کی شاعری اوراس کے تمام موضوعات،تصوف، واردات عشق،اخلاقیات،خمریات،رندی و درویشی،حیات وکائنات کے مسائل بھی اس کے تصرف میں آگئے۔فارسی آہنگ ولہجہ،اس کی لحن اورلے،استعارات وتشبیہات کارنگ ومزاج،رمزیات وصنعیات،علامات اور تلمیحات،بندش وتراکیب نے اردوشاعری کارخ بدل دیااور میر،سودا،درد جیسے شاعروں کے لیے راستہ صاف کر دیا۔رد عمل کی تحریک کے زیراثراب شاعری تلاش الفاظ تازہ کی بجائے جذبات وواردات عشق کے فطری وبے ساختہ اظہارکاذریعہ بن گئی۔دوسری بڑی تبدیلی شعر کی زبان میں آئی ولی دکنی کے بجائے شاہ جہاں آباد کی اردوئے معلٰی نے لے لی۔"[2]

اردو میں اصلاح زبان کی تحریک کا آغاز مرزامظہر جانِ جاناں نے کیاتھااوراسے ایک مذہبی اور سیاسی ذمہ داری خیال کیااوراپنے شاگردوں کی مدد سے اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی:

"اصلاحِ زبان کی تحریک میں میرزامظہر جانِ جاناں کواوّلیت حاصل ہے۔انھوں نے فارسی اورار دوزبان کوایک ہی تار سے بُننے کی کوشش کی اوراصلاحِ زبان کومذہبی اور سیاسی فریضہ سمجھ کر سرانجام دیا۔ان کی منفرد عطایہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں میں سے انعام اللہ یقین،میر باقر حزیں،ہیبت قلی خاں حسرت،احسن اللہ خاں بیان،محمد فقیر دردمند،شاہ قدرت اللہ قدرت اور بساون لعل بیدار کو نئی زبان میں شعر کہنے پر آمادہ کیا۔"[3]

"خواجہ میر دردنے اصلاحِ زبان کی تحریک کوتصوف کے آئینے میں دیکھااور حرفِ دوئی کومٹانے کے لیے خوش تراور لطیف زبان فروغ دینے کی کوشش کی۔درد کی حیثیت ایک ایسے شاعر کی ہے جو شمع انجمن کی طرح ایک جگہ مسند آراتھالیکن اپنی روشنی دورتک بکھیر رہاتھا۔ان کے ہاں لفظوں کے انتخاب میں شعوری کاوش نظر نہیں آتی بل کہ زیرِلبی کی کیفیت نے زبان کودردمندی،روانی اور نغمگی عطاکر دی ہے۔"[4]

میر تقی میر کے عہد کی اردوزبان کی اہم خصوصیات کااحاطہ یوں کیاجاسکتاہے:

- "خدائے سخن"میر تقی میر کی اردوزبان وادب کے ضمن میں خدمات کاجائزہ لیاجائے تو معلوم ہوتاہے کہ انھوں نے اردوزبان کوایک خالص،ٹھیٹھ اور معیاری اسلوب عطاکیاہے۔انھوں نے بلاشبہ فارسی الفاظ وترااکیب کااستعمال کیامگر اردوزبان کے قالب میں ایسے ڈھالاکہ فارسی زبان کی سلطنت زوال پذیر ہوگئی اورار دوزبان کی حاکمیت مسلّم ہوگئی۔
- میرنے اپنے کلام میں غیر معمولی انداز سے سلاست،سادگی اورروانی پیدااکی ہے۔روزمرہ،محاورات اور تراکیب کوایسی خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیاکہ قاری ان کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔ان کے اسلوب کی یہی سادگی ان کی شاعری میں غنائیت اور موسیقیت کاسبب بنی ہے جوکلام کی جان خیال کی جاتی ہے۔
- میرنے اپنے کلام میں،اپنے ماحول کی پیش کش کویقینی بنایا۔چوں کہ وہ عوام سے گہری وابستگی رکھتے تھے،لہٰذاانھوں نے اپنے آس پاس کی زندگی،سوزوگداز،رنج وغم اور سماجی حالات کوبڑے بے تکلف اور سادہ سے انداز میں پیش کیاہے۔"دل سے جوبات نکلتی ہے،اثر رکھتی ہے"کے بمصداق میر کے کلام کی تاثیر مسلمہ ہے۔
- عہدِمیر اردوزبان کے اس دور سے متعلق ہے جس میں"دبستانِ دہلی"کاڈنکابجتاتھا۔چوں کہ میر بھی اسی دبستان سے تعلق رکھتے تھے،اسی لیے میرے کی شاعری بھی اس دبستان کے اوصاف یعنی داخلیت،سوزوگدازاور تصوف کی حامل دکھائی دیتی ہے۔میر کے ساتھ ساتھ مرزامحمد رفیع سودا،خواجہ میر درد اور میر سوز کاتعلق بھی اسی عہد سے ہے۔ان شعرانے اردوغزل کوبام عروج پر پہنچادیا۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
Vol.8. No.2.2025

- یہ وہ زمانہ ہے جس میں فارسی اور ہندی زبانوں کا امتزاج دکھائی دیتا ہے (جو کہ عہد حاضر میں بھی موجود ہے) مگر میر نے ہندی پنگل یعنی ہندی عروض کو بھی اردو زبان کے مزاج میں ڈھالا۔ فارسی کی مروجہ بحور کے علاوہ ہندی پنگل کو اپنے کلام میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ برتا ہے جس نے اردو کو ایک نیا آہنگ عطا کیا۔
- میر نے زبان کو خوب صورت ہی نہیں بنایا بل کہ صنائع بدائع کے موزوں استعمال کیا جس نے نہ صرف میر کے کلام بل کہ اردو زبان کو بھی معنوی گہرائی اور اثر انگیزی پیدا کی۔

میر نے بالخصوص اردو غزل کو عروج بخشا اور اسے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کی پختگی اور وسعت (جو اردو زبان کے لیے بھی ہے) متاخرین کے لیے ایک معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ میر کی شاعری اردو زبان وادب کا بہترین سرمایہ اور مثال خیال کی جاتی ہے۔

میرؔ وسوداؔ کے ہاں وہ قدیم الفاظ بھی مصروف عمل ہیں جو بعد ازاں متروک قرار پائے۔ ان الفاظ کی قدیم اور متروک کے ساتھ ساتھ ان کی اصلاح یافتہ صورت بھی پیش کی جاتی ہے۔ ان الفاظ میں ’آگو (آگے)، قلابا (قلابہ)، پیچھو (پیچھے)، تدھر (ادھر) لیکن تابع مہمل کی صورت میں ’جدھر تدھر‘ اب بھی مستعمل ہے، ملیاں (ملیں)، اس کے گئے (اس کے جانے کے بعد)، تیں (تُو، تُونے) ارنہ (وگرنہ، ورنہ) ، ان نے (اس نے)، یاتیئں (یاں تک)، کریو (کیجیو، کرنا)، جدی (جدا) رون (رونا)، اپر (اوپر)، کسو (کسی)، اودھر (اُدھر)، بات (بتا)، کبھو (کبھی)، کنے (پاس)، بآں کہ (باوجودیکہ)، نشا (نشہ)، تجھ تیئں (تجھ تک)، لیک (لیکن)، پھتروں (پتھروں)، جن نے (جس نے) کیتیں (کو)، لاگا (لگا)‘ وغیرہ بہت اہم ہیں۔

> ”میر تقی میر (۱۷۲۵ء تا ۱۸۱۰ء) اور مرزا سودا (۱۷۱۳ء تا ۱۸۱۰ء) کا دور لسانیاتی تنوع کے حوالے سے ایک اہم دور ہے۔۔۔ میر و سودا کے زمانے میں زبان بہت نکھر گئی تھی۔ فارسی کے محاورے کثرت سے استعمال ہو رہے تھے اور اس رنگ میں ڈھل گئے تھے کہ بدیسی نہیں لگتے تھے۔ زبان کی لغت بڑھ گئی تھی اور ہر صنف سخن پر مشق آزمائی ہو رہی تھی۔ خصوصاً میر نے صنف غزل کو کمال بخشا اور سودا نے قصیدے کی صنف کو بام عروج پر پہنچا دیا۔۔۔ اگرچہ میر کی زبان عوامی زبان ہے جس کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھنے والے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سادہ آسان رواں ہے۔ میر کا ذخیرہ الفاظ لغت نہیں بلکہ عوام سے جمع ہوا ہے۔“[5]

ولی دکنی کے عہد میں مستعمل بہت سے الفاظ کا املا میر تقی میر کے ہاں بدل جاتا ہے، جیسے: ’کئ‘ کو ’کوئی‘، ’نزیک‘ کو ’نزدیک‘، ’اون سوا‘‘ کو ’ان کے سوا‘، ’سیں۔ سیوں۔ سیتی‘ کو ’سے‘، ’چند‘ کو ’چاند‘، ’اتا‘ کو ’اتنا‘، ’دارو‘ ’دوا‘، ’منے‘ کو ’میں‘، ’کیتا‘ کو ’کیا‘، ’نئیں‘ کو ’نہیں‘، ’اچھے‘ کو ’ہے‘، ’کارمت‘ کو ’کرمت‘، ’کوں‘ کو ’کو‘، ’کن رکنے‘ کو ’پاس‘، ’کدھی‘ کو ’کبھی‘، ’جھلکار‘ کو ’جھلک‘، ’جالے‘ کو ’جلائے‘، ’جیو‘ کو ’جی‘، ’جنہوں آگے‘ کو ’جن کے آگے‘، ’تجھ بھواں‘ کو تیری بھوؤں‘، ’سرج‘ کو ’سورج‘، ’کسو‘ کو ’کسی‘، ’دکھو‘ کو ’دیکھو‘، ’جھٹا‘ کو ’جھوٹا‘، ’دکھا‘ کو ’دیکھا‘، ’بیجلی‘ کو ’بجلی‘، ’تمنا‘ کو ’تمہارے‘ وغیرہ میں تبدیل کیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید، میرؔ کے الفاظ کے ظاہری اور باطنی مضبوط رشتہ کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

> ”میر کی زبان نے اردو گرامر کو بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سیر، جراحت، جان، سطح، خلش وغیرہ کو مذکر اور خواب، گلزار، حشر، مزار وغیرہ کو مونث باندھا۔ ندا کی حالت میں الفاظ کی جمع فارسی طریق کے مطابق لائی گئی۔ چنانچہ بتاں، بلبلاں، آوارگاں، موزوں طبعاں وغیرہ بیسیوں الفاظ میر کے رنگ خاص کے غماز ہیں۔ اسی طرح جمع مونث میں الف اور نون کے لاحقے کام میں لائے گئے اور افعال اور صفات کو بھی یوں جمع بنالیا۔ بے وفائیاں، کج ادائیاں، زلفیں، دکھائیاں، باتیں نہ مانیاں وغیرہ، میر نے زبان میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان سے حرف اضافت بھی حذف کر دیا ہے۔“[6]

ڈاکٹر جمیل جالبی میر ؔکی لسانی معراج کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"میر نے عام بول چال کی زبان کو شاعری کی زبان بنا کر جاگیر دارانہ ذہنیت کا وہ بت بھی توڑ دیا جس نے زبان کی حقیقی ترقی کو روک رکھا تھا۔ یہ اتنا بڑا اور مثالی تجربہ تھا کہ ہر دور کو زبان کی سطح پر یہ کام مسلسل کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ ہندی الفاظ کا اخراج بھی عام زبان کے استعمال کا نتیجہ تھا۔"[7]

میر کے ہم عصر شاعر مرزا محمد رفیع سودا(۱۷۲۳ء تا ۱۷۸۱ء) نے بھی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن جو مقام قصیدے میں پایا کسی اور صنف میں وہ مرتبہ حاصل نہیں کر سکے۔ سودا نے صنف قصیدہ کو اتنا بلند کر دیا کہ اس میں لفظ و معنی کے نئے جہان آباد ہو گئے اور یہاں تک کہ قصیدہ کی صنف سودا سے وابستہ ہو گئی۔ سودا کو فارسی زبان پر مکمل عبور تھا لیکن سودا نے فارسی گوئی سے ریختہ کی طرف رخ کیا۔ یہ ایک بہت بڑی لسانی تبدیلی تھی جسے سودا نے اپنے کلام میں علامات، تشبیہات واستعارات، صنائع بدائع کی خوبی کے ساتھ نبھایا اور معیار شعر وہی فارسی رکھا۔ سودا اپنے مخصوص لسانی نظریات رکھتے تھے جن کا اظہار "عبرت العارفین" میں سودا نے کیا ہے۔ سودا کے نزدیک شاعری میں زبان، روزمرہ اور محاورہ کی صحت کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ صنائع بدائع کے استعمال میں تصنع مناسب نہیں ہے۔ شاعری کے لیے برجستگی ضروری ہے۔ ابلاغ ہونا چاہیے شاعر جو کہنا چاہتا ہے وہ کہے اور لوگ اسے سمجھیں۔ اسی طرح وہ ندرت بیان کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان اصولوں کی پابندی خود سودا کے کلام کا خاصہ ہے۔

سودا کے قصائد کے لسانی تجربے کا تجزیہ جمیل جالبی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"سودا نے چونکہ فارسی روایتِ قصیدہ سے اپنے قصائد کا چراغ روشن کیا اس لئے فن قصیدہ کے ان تمام لوازمات کو پورے طور پر برتا جو فارسی قصیدے میں پائے جاتے تھے۔ مثلاً مطلع کا متوجہ کرنے والا بناؤ، تشبیب کی سجاوٹ، گریز کی برجستگی، مدح کی شان، عرضِ مدعا میں شائستگی اور دعا میں آواز خلوص۔"[8]

میر تقی میر (1723-1810) کا عہد اردو زبان وادب کا "عہدِ زریں" کہلاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب اردو اپنی تشکیل وارتقا کی منازل تیزی سے طے کر رہی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اردو زبان، فارسی زبان کے اثرات سے نکلتے ہوئے ایک خود مختار اور بھرپور ادبی زبان کے حوالے اپنی الگ شناخت بنا رہی تھی۔

اردو زبان کے "عہدِ زریں" سے تعلق رکھنے والے ایک اور شاعر، جنھیں مرزا محمد رفیع سودا (1713-1781) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کا شمار بھی اردو کے عظیم کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے اور جو میر کے ہم عصر تھے۔ یہ وہ دور ہے جو اردو زبان وادب کی آبیاری کے لیے بہت ہی زرخیز اور سنہری زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ سودا کی زبان اردو میں انفرادیت کی حامل ہے۔ ان کی زبان میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان کا ذیل میں احاطہ کیا جاتا ہے:

- سودا کی زبان اران کے کلام میں فارسی زبان کی گہری چھاپ موجود ہے۔ قصیدہ گوئی ان کی شہرت کا بنیادی سبب سمجھی جاتی ہے۔ فارسی زبان کے الفاظ، روزمرہ، محاورات اور تراکیب کو انھوں نے ایسے خوب صورت انداز سے برتا ہے کہ وہ اردو زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان کے قصائد میں فارسی زبان کا ایک عالمانہ اور پر شکوہ انداز دکھائی دیتا ہے۔
- سودا کے کے کلام خصوصاً قصیدہ گوئی میں جوش بیان اور خطابت کے باعث ان کی زبان میں شان و شوکت اور متانت کی کیفیات جھلکتی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں الفاظ کا انتخاب، جملوں کی بناوٹ اور انداز بیان قاری پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، سلاست اور روانی کے بجائے فصاحت وبلاغت، زور بیان اور شان و شکوہ موجود ہے۔
- سودا قاموسی علمیت رکھتے تھے اور الفاظ کو بڑی چابک دستی اور ہنر مندی کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور زور بیان ان کی وجہ شہرت بنا۔ ان کی زبان (بالخصوص ان کے قصائد اور ہجویات) میں گونج اور گھن گرج کی کیفیت موجود تھی۔
- سودا نے اردو زبان کی کئی ایک شعری اصناف کو اپنایا جن میں قصیدہ، مثنوی، غزل اور ہجو اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تمام اصناف میں سودا کی زبان ایک منفرد روپ میں ہمارے سامنے آئی۔ مثال کے طور پر:

- قصائد میں سودا کی زبان انتہائی بلند، فارسی آمیز، اور پر شکوہ انداز کی حامل تھی۔ وہ ہر رنگ کے مضامین کو بہترین الفاظ میں بیان کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔
- ان کا طنز و مزاح اور کاٹ دار زبان مخاطب کو ہلا کر رکھ دیتے تھے۔ ہجویات میں ان کا لہجہ شدید اور تند و تیز ہوا کرتا تھا۔ ان کی ہجویات میں عام بول چال اور ٹھیٹھ اردو کے محاورات کا استعمال بھی بہ کثرت دکھائی دیتا ہے۔
- سودا کی غزل میر جیسی سادگی اور سوز و گداز سے مکمل طور پر عاری تو نہیں مگر اس میں الفاظ کی گھن گرج، پر شکوہ انداز اور متانت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

- سودا نے اپنی غزل کو موثر بنانے کی خاطر نادر و نایاب اور خوب صورت تشبیہات و استعارات کو ایک نیا انداز بخشا۔ ان کی تمثیل نگاری بھی ایک خاص انداز اور اعلیٰ پائے کی ہے۔
- سودا مرکزیت کے قائل نہ تھے بل کہ اس سے گریز کرتے تھے اور وسعت کے خواہاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خود کو دہلی کی زبان سے منسلک رکھنے کے بجائے اپنے کلام میں ذخیرہ الفاظ کو وسعت دی اور علاقائی زبانوں کے الفاظ و محاورات کو بھی بہ کثرت استعمال کیا۔

مرزا محمد رفیع سودا کی زبان اردو شاعری کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ انہوں نے اپنی کاوشات کے ذریعے اردو زبان کو وہ مقام و مرتبہ عطا کیا کہ اردو فارسی زبان سے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہو جائے۔ اب یہ ایک ایسی زبان بن چکی تھی جو اعلیٰ اور بلند پایہ مضامین بیان کرنے کی صلاحیت کی حامل ہو چکی تھی۔ ان کی زبان نے متاخرین کو متاثر کر کے اردو زبان و ادب کے ارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا۔

میر حسن نے مثنوی ''سحر البیان'' میں اپنی سحر لفظی، صفائی بیان اور لطف محاورہ، شوخی مضمون، نزاکت، طرز ادا، مکالماتی رنگ، سہل ممتنع، سوال و جواب کی نوک جھونک اور فصاحت و بلاغت سے اردو زبان کو ایک خوب صورت لسانی رنگ دیا۔ میر حسن نے رعایتِ لفظی، صنائع بدائع صنعت ایہام، تشبیہات و استعارات سے مثنوی کی زبان کو سجایا ہے۔ مثنوی میں مکالموں کا بہت دلچسپ اسلوب سامنے آیا ہے۔ اس مثنوی میں قدیم روایت ور جدید طرز ادا دونوں ملی جلی ہیں۔ جس سے زبان و بیان میں ایک روانی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے میر حسن کی زبان اور ان کے طرز بیان کے بارے میں بیان کیا ہے:

> ''ان کی زبان عام بول چال کی زبان ہے جو نظم میں استعمال ہونے کے باوصف نثر سے قریب تر ہے اور نثر سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی اس میں شاعری موجود ہے۔ میر حسن اپنی بات کو بیان کرنے کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے لفظ و معنی کا ایسا رشتہ قائم ہو جیسے روح اور قالب میں ہوتا ہے۔ الفاظ کی ترتیب ایسی ہو کہ جس سے روانی اور بے ساختگی میں اضافہ ہو اور ذہن براہ راست معنی تک پہنچ جائے۔ الفاظ سے بیان میں ایسے رنگ بھرے جائیں جو فطری بھی ہوں اور دلکش بھی اس لیے وہ موقع محل کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں۔'' [9]

نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء سے ۱۸۳۰ء) اس دور کا ایک عوامی شاعر اور عہد ساز شخصیت ہے۔ اس نے طویل عمر پائی۔ مغل تہذیب کا زوال اور برطانوی استعمار کا عروج، میر و سودا سے لے کر ناسخ و آتش تک اردو شاعری کا ارتقا دیکھا اور پھر پیش رو کے پورے دور کی معاشرتی اور معاشی صورت کو جس باریک بینی اور گہرائی سے بیان کیا ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر اپنے عہد کے حالات کو اس انداز میں بیان کر سکا ہو۔ ان کا ذخیرہ الفاظ اتنا زبردست اور عظیم الشان ہے کہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے پاس نہیں۔ ان کی قوت مشاہدہ اتنی باریک ہے کہ مناظر، تخیل اور جذبات کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی بیان کرنے سے گریز نہیں۔ ان کی نظم کا اصل جادو موسیقیت اور آہنگ ہے جو قدیم شاعری میں نہ تھا:

> ''نظیر کے ہاں بہت سی نظموں میں الفاظ کی آوازیں اور ان کی ترتیب، مختلف سازوں کی جھنکار اور فی زمانہ واقعات بھی ملتے ہیں۔ وہ آگرے کی ''عوامی بولی'' میں شعر کہتے ہیں اور برج بھاشا کی ''دیہاتی بولی'' میں بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کی

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
Vol.8. No.2.2025

زبان شستہ نہ تھی۔ جب کہ ان کے عہد میں "شرفائے اردو معلیٰ" کی بول چال یا لکھنؤ کی صیقل شدہ زبان مستر د تھی۔ ان کی شاعری میں عروض و قوافی بلکہ اصناف شعر کے قواعد وضوابط کی بھی بڑی لاپرواہی ملتی ہے۔ اور مزے کی بات ہے کہ وہ اس کو معیوب نہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے غزلیں، قصیدے، مثنویاں اور ترجیع بند وغیرہ لکھے لیکن ان متین اصناف اوران کی متین تر زبان سے ان کو مزہ نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دل کی حسرت نظموں سے پوری کی۔"[10]

ڈاکٹر جمیل جالبی، نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ذخیرۂ الفاظ، اس عہد کی تہذیب کی عکاسی کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

"نظیر نے جتنے الفاظ استعمال کیے ہیں اتنے الفاظ کسی اردو شاعر حتیٰ کہ میر انیس نے بھی استعمال نہیں کیے۔ انہوں نے سینکڑوں الفاظ اپنے گردوپیش زبانوں اور بولیوں سے لے کر اردو زبان میں ایسے ٹانک دیئے ہیں کہ وہ آج اس زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ لفظوں کی سطح پر یہ کام بہت کم شاعروں نے کیا ہے۔"[11]

نظیر اکبر آبادی کے شعری اوصاف اور آہنگ کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

"نظیر کی نظموں کو دیکھیے تو ان میں صوتی آہنگ بہت فعال اور متحرک ہے۔ اس کے صوتی آہنگ کی تشکیل میں غیر روایتی شعری لغت کا استعمال ہے۔ ایسی شعری لغت جو بول چال کی زبان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ "سحر البیان" یا "گلزارِ نسیم" کے صوتی آہنگ کی روایت سے قطعاً بے نیاز ہے۔ اس کے صوتی آہنگ کو اردو شاعری کی روایتی جمالیات سے بھی کوئی تعلق نہیں یہ آہنگ ملائم، نازک، لطیف اور مسرور آوازوں سے بھی سلسلہ نہیں جوڑتا ہے۔ نظیر کا صوتی آہنگ بول چال کی عام زبان سے مرتب ہوتا ہے وہ لفظوں کی اصوات سے شعری ماحول تخلیق کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کا کمال فن بالخصوص اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب لفظوں سے ان کے معنوی آہنگ اجاگر ہوتے ہیں لفظ خود بولنے لگتے ہیں اور ان کی آوازیں ان داخلی معنویت سے مل کر آہنگ بلند کرتی ہیں۔[12]

"دبستان لکھنؤ کے بانیوں میں شیخ امام بخش ناسخ (1772-1846) کی زبان اردو شاعر ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ خیال کی جاتی ہے۔ اس عہد نے اردو زبان کی لسانی اور ادبی ساخت کو ایک نئی شکل وصورت دی۔ اس دور میں زبان کی صفائی اور رعایت لفظی پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ ناسخ نے اردو زبان کی اصلاح کے لیے بہت سی خدمات سرانجام دیں جن کا اعتراف ہر عہد کے ناقدین نے اپنے اپنے انداز میں کیا ہے۔ ان کی زبان کی اصلاح اوراس کے شاعرانہ استعمال کی خصوصیات کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

- ناسخ نے اردو زبان کی اصلاح اور تہذیب کے لیے بہت سے کا ہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے بہت سے الفاظ کو متروک قرار دیا جو اردو زبان کی سادگی، روانی اور سلاست میں رکاوٹ کا باعث بن رہے تھے۔ ایسے الفاظ کو انھوں نے نہ صرف ترک کر دیا بلکہ انھیں نئے، زیادہ شان دار اور فصیح الفاظ کے ساتھ بدل دیا۔ انھوں نے اردو کو فارسی اور عربی کے معیاری الفاظ سے مزین کرنا اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا۔ اسی وجہ سے انھیں "معمار زبان" کا درجہ دیا جاتا ہے۔
- لکھنوی محاورہ اور روزمرہ: اگرچہ ناسخ نے زبان کو بہت چھان پھٹک کر استعمال کیا، تاہم انہوں نے لکھنوی محاورے اور روزمرہ کو شاعری میں ایک خاص مقام دیا۔ ان کے کلام میں لکھنؤ کی خاص زبان کی چاشنی اور نزاکت کا عمل دخل زیادہ دکھائی دیتا ہے۔
- صنائع وبدائع کا کثرت سے استعمال: ناسخ کی زبان کو صنائع وبدائع (صنائع لفظی ومعنوی) کے کثرت سے استعمال نے انفرادیت بخشی ہے۔ انھوں نے رعایت لفظی، ایہام، تضاد اور تشبیہات واستعارات کو کمال مہارت سے استعمال کر کے اپنے کلام کو حسن بخشا۔ بعض اوقات صنائع وبدائع کا کثرت سے استعمال ان کے کلام میں گہری معنویت پیدا کرنے کے بجائے صرف لفظی چمک اور شکوہ الفاظ کا باعث ہوا جو ان پر تنقید کا باعث بھی ہوتی ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.8. No.2.2025

- ناسخ نے اپنے کلام میں رعایت لفظی سے بہت زیادہ کام لیا۔ انھوں نے لفظی بازی گری کا تاثر پیدا کرنے کے لیے ایک لفظ کے مختلف معانی اور اس سے ہم آہنگ الفاظ کو خوبی سے برتا۔ یہی ان کے اسلوب کا بنیادی تعارف بنا کیوں کہ انھوں نے رعایت لفظی پر بہت زیادہ زور دیا۔
- متانت اور وقار :ناسخ کی زبان ایک خاص قسم کی متانت، سنجیدگی اور وقار کی حامل ہے۔ ان کے کلام میں عامیانہ پن اور بازاری الفاظ کا استعمال دکھائی نہیں دیتا۔ ان کا واحد مقصد زبان کو ایک ادبی مقام اور شاندار صورت دینا تھا۔
- عربی و فارسی الفاظ کی فراوانی :ناسخ کے کلام میں عربی اور فارسی کے ثقیل اور کم مستعمل الفاظ کی فراوانی نظر آتی ہے۔ ان کا ایک مقصد فارسی اور عربی کی لسانی خصوصیات کو اردو میں ضم کرنا بھی تھا، جس سے زبان میں ایک قسم کی عظمت تو ملی مگر یہ عمل پیچیدہ بھی ثابت ہوا۔

تشکیلِ "دبستان لکھنؤ" ناسخ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ یہ ان کی زبان کے باعث ممکن ہوا۔ "دبستانِ لکھنؤ" کے شعرا زبان کی صفائی، صنائع بدائع کے استعمال اور لکھنوی تہذیب کی عکاسی کے قائل تھے اور وہ اس پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔

اگرچہ آتش اور ناسخ کے دور میں دس سال کا فرق ہے تاہم دونوں کی شاعری میں لسانی اعتبار سے بہت فرق ہے آتش کے ہاں لفظوں کی معنویت کا ہی نہیں بل کہ داخلیت کا بھی فرق ہے۔ آتش کے ہاں متروک الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ ان کو ناسخ نے استعمال نہیں کیا۔ اسی طرح اعلان نون کے سلسلے میں آتش کے ہاں عام بول چال کی زبان ملتی ہے۔ آتش نے اردو شاعری میں فارسی کے مصادروں کو استعمال کیا جب کہ ناسخ نے ان کو ترک کر دیا تھا۔ آتش نے دہلی کی لسانیاتی روایت سے بھی استفادہ کیا اور دہلی میں بولے جانے والے روزمرہ، محاورات کو بھی کہیں کہیں استعمال کیا ہے۔

شیخ امام بخش ناسخ نے جس طرح زبان کی اصلاح کی، اس کا ذکر باقر شمس نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "حقیقت یہ ہے کہ جس وقت زبان بھونڈی لفظوں بھدی ترکیبوں الجھے ہوئے فقروں اور غلط لفظوں سے خارزار اور شاعری پست، مبتذل خیالات، عامیانہ اور سوقیانہ لفظوں سے داغ دار تھی۔ اس وقت فطرت کی فیاضی نے ناسخ کو ایک پیغمبر سخن اور ایک مجدد ذہن عطا کر کے بھیجا جو دنیا میں کسی شاعر کو نہیں ملا۔ اور اسی عطیہ فطرت کی بدولت انھوں نے اپنی ایجادوں، اصلاحوں اور اختراعوں سے زبان و شاعری میں اتنی خوبیاں بھر دیں جو اس سے پہلے اس میں نہ تھیں اور وہ ایک نئی شکل و صورت میں رعنائی اور دلربائی کے ساتھ سامنے آئی اسی لیے وہ ایک طرز جدید کے موجد اور طرز قدیم کے ناسخ کہے جاتے ہیں اور کسی چیز کو ایک نئی صورت بخشا پر دل و دماغ کا کام نہیں ایسی شخصیت صدیوں میں بھی پیدا نہیں ہوتی۔"[13]

ناسخ کی زبان نے اردو شاعری کو ایک نیا لسانی معیارات سے روشناس کرایا۔ انھوں نے زبان کی تراش خراش کر کے اس کی نوک پلک درست کی اور اس میں نئے الفاظ شامل کر کے اسے ایک خاص ادبی شکل دی۔ اگرچہ ان پر صنائع وبدائع کے زیادہ استعمال کا الزام لگا، مگر ان کی زبان نے اردو شاعری کو وسعت دے کر اسے نیا ادبی عروج عطا کیا۔

خواجہ حیدر علی آتش (1778-1848) "دبستان لکھنؤ" کے اہم ترین شعرا میں سے ایک ہیں۔ بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی۔ ناسخ کے ساتھ وہ اس دبستان کے بانی تسلیم کیے گئے ہیں۔ تاہم ان کی زبان ناسخ سے کچھ مختلف رنگ اور منفرد خصوصیات کی حامل تھی۔ وہ اپنے اس نظریے کے سختی سے قائل دکھائی دیتے ہیں:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کی زبان کی اہم خصوصیات کچھ اس طرح ہیں:

- ناسخ کے بر عکس، آتش نے رعایتِ لفظی اور صنائع وبدائع کے بے جا استعمال کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا۔ ان کی زبان میں فطری، رواں اور سادہ تھی۔ وہ لفظی بازی گری سے گریز کرتے ہوئے اپنے جذبات اور خیالات کو براہ راست انداز میں بیان کرنے کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ایک خاص قسم کی تازگی اور برجستگی کا عمدہ نمونہ ہے۔
- آتش نے محاورہ اور روز مرہ کا انتہائی خوبصورت اور بر محل استعمال کیا ہے۔ ان کے فن کارانہ انداز سے لکھنؤ کے ٹھیٹھ محاورات ان کی شاعری کے بدن میں روح کا درجہ پا گئے۔ یہ محاورات ان کے کلام میں سلاست پیدا کرنے کے علاوہ اسے ایک خاص لکھنوی چاشنی بھی عطا کرتے ہیں۔
- آتش کا اسلوب ناسخ کے نسبتاً ثقیل اور عالمانہ اسلوب کے بجائے سادہ، رواں اور عام فہم تھا۔ ان کے کلام میں الفاظ کا انتخاب ذہن پر بوجھ ڈالنے کے بجائے قاری کو آسانی سے سمجھ آجاتا ہے۔
- آتش الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ان کے ہاں الفاظ کی در وبست (یعنی الفاظ کو صحیح جگہ پر جمانا) اور چستی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ایک ایک لفظ اپنی جگہ موزوں اور نگینے کی طرح جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اسے بدلنے کی گنجائش دکھائی نہیں دیتی۔ یہ وصف ان کے کلام کو مزید مؤثر اور خوب صورت بنانے کا موجب بنتا ہے۔
- ناسخ کی زبان میں درباری اور اشرافیہ کا رنگ غالب تھا، مگر آتش نے متوسط طبقے کی زبان اور طرزِ گفتگو کو اپنے کلام کا موضوع بنایا جو ان کی عوامی مقبولیت اور حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔
- لفظی حسن کے ساتھ معنوی گہرائی: اگرچہ آتش نے صنائع وبدائع کا کم استعمال کیا، مگر ان کا کلام لفظی حسن اور معنوی گہرائی سے مملو دکھائی دیتا ہے۔ وہ الفاظ کے صحیح استعمال سے اپنے کلام میں گہرے معانی اور بلیغ اشارے پیدا کرنے کا کام لیتے تھے۔

> "آتش کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ لکھنؤ میں دہلوی رنگ کے شاعر تھے۔ آتش نے جو شاعری کی وہ لکھنؤ کے ماحول میں رہ کر ہی کی جا سکتی تھی۔ اس میں لکھنوی تہذیب کے وہ رخ، وہ پہلو بھی موجود ہیں جو عام طور پر ناسخ اور دوسرے ہم عصر شعرا کے ہاں ملتے ہیں اور وہ پہلو بھی جو کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتے اور جسے غالب نے "چیزِ دگر" اور "تیز نشتر" کہا ہے اور جو آتش کی انفرادیت اور ان کا امتیاز ہے۔ یہ رنگ سخن لکھنوی تہذیب کی روحِ لطیف کا ترجمان ہے۔" [14]

خواجہ حیدر علی آتش کی زبان اردو شاعری میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ انھوں نے ناسخ کی لسانی اصلاحات کو ایک فطری اور عوامی رنگ عطا کیا۔ ان کی شاعری نے اردو کو سادگی، روانی، اور محاورات کے خوب صورت استعمال کے ذریعے مزید نکھارا۔ آتش کی زبان آج بھی اپنی چاشنی، برجستگی اور بے ساختگی کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں لکھنوی زبان کا ایک اہم معمار خیال کیا جاتا ہے۔

اردو شاعری میں اصلاحِ زبان کی تحریک کے نتائج انتہائی اہم اور دور رس ثابت ہوئے۔ اس تحریک نے شاعری کو محض لفظی بازیگری اور مصنوعی تکلفات سے نکال کر زیادہ بامعنی، رواں اور عوامی رسائی کے قابل بنایا۔ اصلاحِ زبان کی تحریک نے شاعری میں سادگی اور سلاست کو فروغ دیا۔ وہ مشکل، ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال کی حوصلہ شکنی کی گئی جنہیں عام قاری سمجھ نہیں پاتا تھا۔ اس کی جگہ روز مرہ اور عام فہم الفاظ کے استعمال پر زور دیا گیا، جس سے شاعری کی ترسیل آسان ہوئی۔

اس تحریک کا ایک بڑا نتیجہ یہ تھا کہ شعرا نے محاورات اور روز مرہ کا استعمال زیادہ سلیقے سے کرنا شروع کیا۔ لکھنؤ اسکول میں جہاں محاوروں کا بے جا اور محض نمائش کے لیے استعمال ہوتا تھا، وہیں اس تحریک نے انہیں فطری اور موقع محل کے مطابق استعمال کرنے پر زور دیا۔ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں پائے جانے والے غیر ضروری تکلفات، قافیہ پیمائی اور صنائع بدائع کی بھرمار کو کم کیا گیا۔ شاعری کو محض لفظی شعبدہ بازی کے بجائے جذبات، خیالات اور تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس نے شاعری کو فطری حسن عطا کیا۔

اصلاحِ زبان نے شاعری کے مضامین میں وسعت اور حقیقت پسندی کو جنم دیا۔ محض روایتی عشقیہ مضامین یا مثالی حسن کی تعریف سے ہٹ کر شاعری میں سماجی، اخلاقی، تعلیمی اور حب الوطنی کے موضوعات کو شامل کیا گیا۔ مولانا حالی کی "مسدس حالی" اس کی ایک بہترین مثال ہے جہاں قوم کی اصلاح اور بیداری پر زور دیا گیا۔ اگرچہ یہ تحریک بنیادی طور پر زبان کی درستی سے متعلق تھی، لیکن اس نے شاعری کے لیے ایک ایسی فضا ہموار کی جہاں نئی شعری اصناف (مثلاً نظم، آزاد نظم) کو قبول کیا گیا۔ یہ زبان کی لچک اور وسعت کا نتیجہ تھا کہ مغربی شاعری کے اثرات اردو میں سرایت کر سکے اور شاعری میں تنوع آیا۔ اس تحریک نے اردو شاعری کو ایک نکھری ہوئی اور معیاری زبان دی۔ شعرا نے الفاظ کے چناؤ، ترکیبوں کی ساخت اور گرامر کی درستی پر خاص توجہ دی، جس سے شاعری مزید پختہ اور دلکش ہوئی۔ مختصراًاردو شاعری میں اصلاحِ زبان کی تحریک نے اسے محض لفظی جادوگری سے نکال کر معنی خیزی، سادگی، سلاست اور وسعت عطا کی، جس سے یہ نہ صرف عوام میں مقبول ہوئی بلکہ اسے عالمی ادب میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔

حوالہ جات

1۔ محی الدین قادری، ڈاکٹر سیّد، ہندوستانی لسانیات، حیدرآباد دکن، شمس الاسلام پریس، 1932ء، ص47-46

2۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد اول)، لاہور مجلس ترقی اردو، 2009، ص 351

3۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، 2013، ص194

4۔ ایضاً، ص195

5۔ شازیہ الیاس، اردو زبان کا تاریخی و لسانی جائزہ (دکنی عہد سے بیسویں صدی تک)، مقالہ مملوکہ: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، فروری2014، ص89

6۔ انور سدید، ڈاکٹر اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، 1978، ص225

7۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد اول)، لاہور، انجمن ترقی اردو، 2008، ص140

8۔ ایضاً، ص689

9۔ ایضاً، ص278

10۔ شازیہ الیاس، اردو زبان کا تاریخی و لسانی جائزہ (دکنی عہد سے بیسویں صدی تک)، مقالہ مملوکہ: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، فروری2014، ص118

11۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد سوم)، لاہور، انجمن ترقی اردو، 2008، ص1019

12۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2003، ص728

13۔ محمد باقر شمس، لکھنؤ کی زبان، کراچی، دارالتصنیف، 1938، ص87

14۔ ابو اللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، 1944، ص727